R-No.2186/57
REGR No. L022

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی پندرہ پیسے

تاریخ اشاعت
۲۲-۱۵-۸-۱

جلد ۲۷ - شمارہ ۲۷ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۱۵ر جولائی ۱۹۶۸ء

اداریہ

بنارس کی کارپوریشن اور اردو

اب تک پارلیمنٹ اور ودھان سبھاؤں میں یہ دستور رہا ہے کہ ممبر جس زبان میں چاہیں حلف لیں۔ اب کے بنارس کی کارپوریشن کے میئر نے انیس ممبروں کو اپنی مادری زبان اردو میں حلف نہ لینے دیا، جس پر یہ ممبر احتجاج کے طور پر ہال سے باہر چلے گئے۔ بعد میں ان کا ایک وفد گورنر سے ملا اور انھیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ اترپردیش کی حکومت نے اب اپنی پالیسی کا اعلان کیا ہے جس کی رو سے ممبروں کو یہ اختیار ہے کہ وہ دستور کے آٹھویں شیڈول میں دی گئی کسی بھی زبان یا انگریزی میں حلف لے سکتے ہیں۔ امید ہے کہ اس اعلان کی روشنی میں بنارس کی کارپوریشن کے میئر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ جن سنگھ کی ریاستی شاخ کے دفتر سے میئر کو اس قسم کی ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ اردو میں حلف لینے کی وہ اجازت نہ دیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو جن سنگھ نے اس معاملے میں بہت بڑی غلطی کی ہے اور ہندوستان کے کچھ شہریوں کو اپنے بنیادی حق سے محروم کرنا چاہا ہے۔ یہ ایک معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس سے ایک خاص ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان کی قومی زبانوں میں اردو بھی ہے اور اترپردیش میں تو ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۷۰ لاکھ سے اوپر اشخاص کی مادری زبان اردو ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعداد اب ایک کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ اتنی بڑی آبادی کی مادری زبان کو نظر انداز کرنا اور اس کے استعمال پر پابندی لگانا ظاہر ہے تنگ نظری اور تعصب کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ یہ کسی طرح ہندی کی خدمت نہیں۔ ہندی اردو کو دبا کر ترقی نہیں کر سکتی۔ ہاں اردو کو ترقی کے مواقع ملیں گے تو اس سے ہندی بھی مضبوط ہوگی اور ترقی کرے گی۔ اترپردیش کے سب رہنے والے ہندی کو اس ریاست کی سرکاری زبان مانتے ہیں۔ وہ سب ہندی کی ترقی چاہتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی کیسے ہوئے کہ اترپردیش کی دوسری زبانوں کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔ اس قسم کی باتوں میں فسطائیت کی بو آتی ہے۔ ہمیں اردو دوستوں سے توقع ہے کہ وہ اس قسم کی رکاوٹوں کا کوئی اثر نہ لیں گے اور ہر جگہ اور ہر حال میں اپنے بنیادی حقوق پر اصرار کریں گے۔ ہمیں صرف حلف اردو میں لینے پر ہی اصرار نہیں کرنا ہے، یہ بھی دیکھنا ہے کہ بنارس کی کارپوریشن کے تحت حسب ضرورت اسکولوں میں اردو کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے یا نہیں، اردو کے استاد مناسب تعداد میں موجود ہیں یا نہیں اور کتابوں کی فراہمی میں کوئی دقت تو نہیں ہوتی۔ امید ہے کہ ہماری بنارس کی شاخ اور ریاستی شاخ دونوں اس معاملے میں چوکس رہیں گے اور اردو کی تعلیم کے سلسلے میں ہر رکاوٹ کو دور کرائیں گے۔

سہ لسانی فارمولے کے سلسلے میں جنوبی ہند کی ایک زبان کو ترجیح کیوں؟

ہمیں یہ اطلاع ملی ہے کہ دہلی کارپوریشن میں سہ لسانی فارمولے کے تحت ہندی اور انگریزی کے بعد تیسری زبان کے طور پر جنوبی ہند کی کسی زبان کو ترجیح دی جائے گی۔ بظاہر قومی یکجہتی کے لحاظ سے یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہے کہ تیسری زبان کے طور پر ہندوستان کی کسی جدید زبان کو لینے کی سہولت ہونی چاہیے۔ یہ بھی اچھی بات ہے کہ جو لوگ جنوبی ہند کی کوئی زبان لینا چاہیں ان کے لیے اس کا انتظام کیا جائے۔ مگر جنوبی ہند کی کسی زبان کو ترجیح دینا، اور دہلی کی علاقائی زبان اردو کو نظر انداز کرنا، ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہونا یہ چاہیے کہ تیسری زبان کے طور پر جس کا جی چاہے اردو لے اور جس کا جی چاہے جنوبی ہند کی کوئی زبان یا بنگالی یا پنجابی پڑھے۔ ترجیح کا لفظ بظاہر معصوم لفظ ہے مگر ہمارے دفاتر اور سرکاری ادارے ترجیح کے معنی یہ لیتے ہیں کہ یہ لازمی ہے۔ اگر دہلی میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ جنوبی ہند کی کسی زبان کو سب کے لئے لازمی کر دیا گیا تو یہ بہت غلط بات ہوگی۔ قومی یکجہتی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تیسری زبان

کسی پر زبردستی مسلط کردی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر جدید ہندوستانی زبان کی تعلیم کی سہولت رہے۔ دہلی کی کارپوریشن کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اردو بھی دہلی کی علاقائی زبان ہے۔ دہلی اردو کا جنم بھومی ہے اور اردو ادب کا بہت بڑا مرکز۔ یہاں تو اردو کی تعلیم کے لیے خاص طور پر سہولتیں ہونی چاہئیں، نہ کہ دشواریاں پیدا کی جائیں۔ دہلی ہندوستان کی راجدھانی ہے۔ یہاں ہر پردیش کے رہنے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں اس لئے تیسری زبان کے طور پر تمام جدید ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کے لئے پوری سہولتیں ہونی چاہئیں اور طلبہ کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ کوئی سی جدید ہندوستانی زبان لے سکیں۔ انتظامی سہولت کے لئے یہ ہو سکتا ہے کہ کم سے کم پانچ طلبہ جب کسی زبان کے پڑھنے کی خواہش ظاہر کردیں تو کارپوریشن اس زبان کی تعلیم کا انتظام کرے۔

محمد احسن مارہروی کا انتقال

علی گڑھ۔ یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے مشہور ناقد وادیب جناب شاہ علی احسن، احسن مارہروی شاگرد داغ دہلوی کے بڑے صاحبزادے سید محمد احسن مارہروی سابق ڈپٹی رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۲ اور ۳ رجولائی کی درمیانی شب میں حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ۱۲ بج کر ۵۰ منٹ پر اس دار فانی سے کوچ کیا۔ موصوف خاندان بلگرام کی آخری نشانی تھے ۸۰ سال سے زیادہ کی عمر تھی مگر وضع داری، رکھ رکھاؤ میں بے مثل تھے۔ نواب مزمل اللہ خاں سے لے کر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین تک کے واقعات وحالات پر آپ ایک مستند شاہد کی حیثیت رکھتے تھے ساتھ ہی ساتھ اپنے خاندانی روایت کے تحت علم وادب اور مطالعہ ادب سے بے انتہا شغف تھا، حال میں اپنی سرگذشت کے چند اوراق مرتب کرنا شروع کیا تھا۔ (سید مرتضیٰ حسین بلگرامی)

اردو میں گزٹ

لکھنؤ: جناب جی ان ڈانگ ڈپٹی کمشنر لسانی اقلیت نے ریاستی انجمن ترقی اردو کے ایک وفد سے ملاقات کے دوران یہ انکشاف کیا کہ ریاستی حکومت نے اردو میں گزٹ شائع کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور یہ گزٹ آئندہ چند دنوں میں جاری ہو جائے گا۔ (قومی آواز)

برطانیہ کا ایک بنک اردو میں اشتہار دیتا ہے

برمنگھم۔ ایک برطانوی بنک جو برطانیہ میں رہنے والے ایشیائیوں میں اپنے گاہک حاصل کرنا چاہتا ہے ایک اشتہار شام کے ایک اخبار میں اردو زبان میں شایع کرے گا اس اشتہار میں بنک کی ۵۰۰۰ شاخوں کا ذکر کیا گیا ہے جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ بنک کے ایک ترجمان نے بتایا ایشیائی لوگ بنکوں میں اپنے حساب کھول رہے ہیں اس لئے میرے بنک نے یہ مناسب سمجھا کہ اسی زبان میں اشتہار دیا جائے جسے زیادہ لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ اشتہار برمنگھم میں چھپا ہے جو برطانیہ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ (سیاست)

فاروقی کے تبصرے شایع ہوگئی

الہ آباد۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کے نوجوان نقاد اور شاعر شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب 'فاروقی کے تبصرے' شائع ہوگئی ہے۔ اس کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی کے وہ خیال انگیز تبصرے شامل ہیں جو انھوں نے ماہنامہ 'شب خون' میں کئے۔ یہ کتاب تین روپے میں شب خون کتاب گھر ۳۱۳ رانی منڈی الٰہ آباد سے مل سکتی ہے۔ (منیجر شب خون کتاب گھر)

ساجد اثر

مجبوری

کئی سال بیتے
میں اپنی انا کے
نرالے ترنم کی انمول ریشم کو
پرہول حالات کی دسترس سے
بچائے ہوئے تھا
مگر وقت نے آج اندھی ضرورت کو
تحریک دے کر
مری زندگی کی ہر اک راگنی کو
تب وقت کے تنور میں جھونک ڈالا
مرے دل کے پارس منی کو
یہ احساس بین کے دھنس سکا
نگلنے لگا ہے
کہ اندھی ضرورت کی
منحوس فطرت سے مجبور ہو کر
مجھے آج اپنی انا کے نرالے
ترنم کو
مجروح کرنا پڑے گا!!

بچوں کے ادب سے متعلق انعامی مقابلہ

نئی دہلی۔ مرکزی وزارت تعلیم نے بچوں کے ادب سے متعلق چودھویں انعامی مقابلے کے لیے ۱۵ راگست تک بچوں کے ادب سے متعلق کتابیں اور قلمی نسخے طلب کئے ہیں۔ مصنفین اور ناشرین اپنی کتابیں بالترتیب تین روپے اور پانچ روپے داخلہ فیس کے ساتھ اس پتہ پر بھیج سکتے ہیں۔ اسسٹنٹ ایجوکیشن ایڈوائزر وزارت تعلیم سیکشن بی ایس ای ۳ شاستری بھون نئی دہلی

تحریر: جرمی شنکر
ترجمہ: اصغر عباس

ویتنامی شاعر فام دوئی کے گیت

پھول پر بارش کے قطرے خوشی کے ان آنسوؤں کے مانند ہیں جو ایک دوشیزہ کی آنکھوں سے اس وقت نکلتے ہیں جب اس کا محبوب جنگ سے واپس آتا ہے۔

پھول پر بارش کے قطرے اس ماں کے تلخ آنسوؤں کی مانند ہیں جو یہ سنتی ہے کہ اس کا بیٹا جنگ میں کام آگیا ہے۔

پھول پر بارش کے قطرے اس نوزائیدہ بچے کی چیخ کے مثل ہیں جب وہ پہلی بار دنیا میں آتا ہے۔

پھول پر بارش کے قطرے ان دو چاہنے والوں کے پیار کی طرح ہیں جن پر ماہ و سال کی گرد پڑ چکی ہے لیکن ان کی محبت "تازہ و شیریں" ہے۔

آج جب کہ اخبارات ویتنام میں امن و امان کی نئی امیدوں کی خبریں شائع کر رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جنگ کا عتاب گزشتہ بیس برسوں کی طرح اب بھی موجود ہے اور اگر ہم یہ کہیں کہ ان بیس برسوں کی نمایاں خصوصیت امید و بیم رہی ہے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ آزادی کی امید کے ساتھ ملک کی تقسیم امن و سکون کی امیدوں کے ساتھ خانہ جنگی کا خطرہ لاحق رہا ہے اور اگر بہتر معیار زندگی کی تمنا کی گئی ہے تو اسے موت کے خطرے نے تاریک بنا دیا ہے۔ چنانچہ امید و بیم کی اس کیفیت کا نقشہ ہمیں ویتنام کے لوگوں کی زندگی کے ہر شعبے میں ملتا ہے اور اس کا سب سے بہتر اظہار ہمیں ویتنام کے لوک گیتوں میں سنائی دیتا ہے۔

ویت کانگ اور شمالی ویت نام کے رہنے والوں کے گیت اکثر جنوبی ویت نام میں ہونے والی جنگ کی تفسیر ہوتے ہیں جن میں انقلاب پنہاں ہے اور جن میں رفاقت کی تمنا ہوتی ہے اور فتح و نصرت حاصل کرنے کا ایقان ہوتا ہے چنانچہ یہ بات تعجب خیز ہی کہی جائے گی کہ جنوبی ویتنام کے لوک گیت شمالی ویتنام کے لوک گیتوں سے زیادہ مشہور اور ہر دل عزیز نہیں ہیں۔

جنوبی ویتنام کے لوک گیت کاروں میں فام دوئی کا مقام بہت اہم ہے۔ بہت سے قوم پرستوں کی طرح جو آج کل سائگون میں ہیں فام دوئی بھی شمالی ویتنام میں پیدا ہوا تھا اور فرانسیسیوں کے خلاف جو سرفروش ویت منہ کے دوش بدوش ملک کی آزادی کے لئے لڑے ان میں یہ پیش پیش تھا جب فتح حاصل ہوگئی اور فرانسیسی ویتنام سے چلے گئے تو فام دوئی نے بھی تقریباً دس لاکھ ویتنامیوں کے ساتھ شمال کو جو اس کا آبائی وطن تھا، اسے خیرباد کہہ دیا تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہے رہ سکے اور گیت کی تخلیق کر سکے۔

فام دوئی کے گیت ویتنام کے دیہاتیوں کی زندگی کا جز بن گئے ہیں شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ دیہاتیوں کی طرح گاؤں گاؤں گھوما ہے اور اس نے اپنی عمر کا بیشتر وقت صرف کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں میں دیہاتی زندگی کے تجربات حاوی ہیں۔ اس کے نغمے پورے ویتنام میں ہر جگہ مقبول ہیں چاہے وہ کسی تیج تہوار کا موقع ہو یا کھیتوں میں کام کرنے کا زمانہ ہر موقع پر فام دوئی کے گیت گائے اور سنے جاتے ہیں۔ اس کے گیتوں میں روایت کا احساس بھی ہے اور نئے زمانہ کا شعور بھی چنانچہ ان گیتوں میں قدیم عشقیہ ترانوں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور جنگ کے طویل اور دل خراش لمحات کا بیان بھی یہی وجہ ہے کہ بعض گیت مغرب میں بھی مقبول ہوئے ہیں اس سلسلہ میں ہم THE RAIN ON THE LEAVES کو بطور مثال پیش کر سکتے ہیں۔

فام دوئی ویتنام کے دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں ویتنامیوں کے جذبات ان کے احساس و ہیجان کے ملے جلے احساسات کو شاعرانہ انداز میں اور ان سے بہتر طور پر پیش کرتا ہے۔ ویتنامی خانہ جنگی سے عاجز آچکے ہیں اب انھیں اپنے نوجوانوں کو جنگ پر بھیجنے سے کوئی دریغ نہیں ہوتا اور وہ ایسی زندگی کے شدت سے خواہش مند ہیں جو انھیں ایک بہتر اور روشن مستقبل کی ضمانت دے سکے۔

فام دوئی کے گیتوں میں سے چند گیت یہاں پیش کئے جا رہے ہیں جنھیں ایک امریکی لوک گیت کار سٹیو ایڈیسن کی شرکت میں شاعر نے خود انگریزی زبان میں ڈھالا ہے اپنے ایک گیت DAY OF HOME COMING میں فام دوئی اس قوم کے غم انگیز خیالات کو پیش کرتا ہے جو جنگ کی آگ میں جل رہی ہے اس قوم کا ایک گھر لوٹنے محبان وطن کا استقبال اس طرح کرتا ہے۔

گھر کو لوٹنے کے دن (خوشی میں)
تم پگڈنڈی پر کودتے چلتے ہو
تم بانس کے بنے ہوئے دروازے سے داخل ہوتے ہو
تمہارے استقبال کے لئے سورج تمہارے بالوں میں بہت زردی بکھیر دیتا ہے۔
تمہاری ماں خوشی کے مارے لڑکھڑانے لگتی ہے
جب وہ ایک ایک قدم بڑھتے ہوئے تالاب کی جانب
تمہاری ہنڈی لے کر جاتی ہے وہ سوچتی ہے کہ یہ سب خواب ہے
وہ بہت زیادہ نڈھال ہو چکی ہے اس کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے بند ہو چکی ہیں۔
گھر لوٹنے کے دن ۔۔۔۔
گھر لوٹنے کا دن ختم ہونے کے بعد
لوگ ایک کسان کو ہاتھوں میں عصا لئے ہوئے دیکھتے ہیں۔

دریائی جانور بھی اس پر رحم کرتے ہیں اور اس کو اس کے کام میں مدد دیتے ہیں۔

گھر لوٹنے کا دن ختم ہونے کے بعد
جلد اگنے کے لئے بیجوں میں مقابلہ ہوتا ہے
ہوا بھی فرحت بخش ہے ماہتاب بھی منور ہے
گھر لوٹنے کا دن گذرنے کے بعد
ایک زخمی سپاہی سکون کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے

بالکل اسی طرح تام دوئی اپنی نظم RECOMMENDATIONS میں بھی وطن کو مزاحمت کی خواہش کو بیان کرتا ہے اور نفسیاتی زندگی کے حسن پر جنگ کے بدنما اثرات کو بے نقاب کرتا ہے۔

میری شریک زندگی تم گھر پر ضرور ٹھہرو
بلبری کے درختوں کی نگہبانی کرو
اور ہماری بوڑھی ماں کی دیکھ بھال کرو
کیونکہ اب میں اپنے اسلحوں کے ساتھ یہاں سے وداع ہو رہا ہوں
مجھے اپنے باغیچہ کی یاد آرہی ہے
جو ہمارے دشمنوں کی وجہ سے بے رونق ہے
اور تم بھی اے میرے بیٹے گھر پر ضرور ٹھہرو
اور ہمیں تم اپنے بارے میں سوچنے دو تاکہ ہم آزادی کے ساتھ رخصت ہو سکیں
اگر میں اپنے دشمن کو زیر کر سکا۔
تو ہماری زندگی تبسم بے اختیار کی مانند حسین ہوگی
لیکن اگر میں بھی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا
تو میرا خون آلود جسم اور میری بندوق تمہارا انتظار کرے گی
تاکہ تم میدان جنگ میں جاؤ اور دشمن سے میرا خون بہا لو

ایک عرصہ کی خانہ جنگی کے باعث آج کا ویتنامی کسان سخت دل اور سخت جان ہو گیا ہے چنانچہ اکثر ماہرین سماجیات کا خیال ہے کہ ویتنامی تہذیب جنگ کو اپنے ہو میں اتار چکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ جنگ کے لئے نفسیاتی طور پر ہر وقت تیار رہتے ہیں اور یہ ان واقعات و حوادث کو ہنستے کھیلتے اپنا لیتے ہیں جو اگر دوسری اقوام پر بیتے تو ان میں انتشار اور بدنظمی پیدا ہو جائے ویتنام میں المیہ کی اسی قربت کے باعث تام دوئی کی اکثر نظموں میں تلخی اور جھلاہٹ کا عنصر پیدا ہو گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ بے باکی بھی ملتی ہے جو دوسرے لوک گیتوں میں نہیں پائی جاتی مثال کے طور پر اپنی نظم THE MOTHER OF GIA LINH میں وہ جنگ کی بربریت کی ایک دلدوز داستان یوں پیش کرتا ہے۔

بوڑھی ماں آلو کا پودا لگانے کے لئے زمین کھود رہی ہے
اپنے اس بیٹے کی پرورش کرنے کے لئے جو کہ رات دن دشمن سے مقابلہ کر رہا ہے اس کے کپڑے تار تار ہو چکے ہیں گھر میں ایک دانہ بھی کھانے کو نہیں ہے۔
دشمنوں نے ہمارے گھروں کو آگ لگا دی ہے اور ہم اس سے انتقام لینے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔
ماں اس بات پر خوش ہے کہ اس کا بیٹا سرجنگ ہے
اسے سخت جدوجہد کرنی پڑ رہی ہے کہ اس کا بیٹا میدان جنگ میں ہے۔
گو اس کے ایک ہی بیٹا ہے لیکن وطن کی محبت اس کے دل میں کسی دوسرے سے کم نہیں رات میں جب وہ جنگ کا بگل سنتی ہے تو اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعا مانگتی ہے۔ جب گاؤں کے لوگوں کی چیخ بلند ہوئی تو بوڑھی ماں سبزیوں میں پانی دے رہی تھی کیونکہ دشمنوں نے اس کے بیٹے کو پکڑ لیا تھا اور سر بازار اس کا سر قلم کر دیا تھا۔
ماں پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے وہ اپنے بیٹے کا سر لینے جاتی ہے
گاؤں کے راستے پر ایک مندر ہے اس مندر کی گھنٹی زور زور سے بجتی ہے۔
ماں اپنے بیٹے کے سر کو اپنے ہاتھ سے اٹھاتی ہے اس کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔
وہ اسے غور سے دیکھتی ہے اس کے چاندی جیسے بال ہوا میں اڑنے لگتے ہیں۔
آہ میں اپنے بیٹے سے محبت کرتی ہوں گو کہ اس کا منہ خون آلودہ ہے لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہے اور اس کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں۔
بندوق کہیں دور گرجتی ہے اور بیٹیوں اور بیواؤں کا دل غم سے بھر جاتا ہے۔
ہر روز میں بوڑھی ماں سے ملنے آتا ہوں اور چولھے کے قریب بیٹھ جاتا ہوں۔
وہ آلو کا سالن تیار کرتی ہے اور چولھے کا دھواں خوشبو کی طرح پھیلنے لگتا ہے۔
گو کہ وہ اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے لیکن بہت سے یتیم بچے دیکھ بھال کے لئے اسے مل گئے ہیں۔
"اے میرے بچو! تم اپنی چائے ختم کرو اور مجھ سے ملنے چلے آؤ

شاید تام دوئی کی نظموں میں امید و بیم کا بہترین امتزاج اس کی غنائیہ نظم THE WOUNDED SOLDIER میں ملتا ہے سادگی و پرکاری کے ساتھ وہ ایک دیہاتی گھرانے کی زندگی بیان کرتا ہے جو جنگ کی تباہیوں کا شکار ہے۔ بیوی بے قراری سے اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی اور استفہامیہ انداز میں کہتی ہے کہ امن و سکون کب قائم ہو کوئی نہیں بتا سکتا؟

ایک دن سہ پہر کے وقت ایک لڑکی
چاولوں کا گٹھا ہاتھ میں لئے ہوئے نظر آئی
اس کے نازک بازوؤں کے لئے یہ بوجھ بہت تھا
اس کا کام ایک مرد کے کام کے برابر ہے

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

اردو ادب میں افادی، مقصدی، اصلاحی، اخلاقی اور نیچرل ادب کی تحریک نے جس ذہنی رویے کو جنم دیا تھا اس کی کوتاہیوں اور نارسائیوں کا احساس اب عام ہو چلا ہے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کے جب ادبی سرمایے کو مبالغہ، جھوٹ اور غلاظت کا پشتارہ سمجھ کر اس کی طرف سے آنکھیں پھیری تھیں اس کی تاریخی، تہذیبی اور لسانی معنویت کا اور اک جدید تنقیدی ذہن کے اہم ترین اکتسابات میں سے ہے۔ اس سلسلے میں قدیم اردو داستانوں کی بازیافت ان کی پشت پر کام کرنے والے عوامل کا تجزیہ اور ان کی ادبی و تمدنی قدر و قیمت کا مطالعہ نئے تنقیدی اصولوں کی روشنی میں جن اصحاب نے کیا ہے ان کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ داستانوں کے معنی خیز عناصر کی طرف جس شخص نے پہلے پہل توجہ دلائی وہ کلیم الدین احمد ہیں جنھوں نے اردو غزل کی ریزہ خیالی سے بد دل ہو کر اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیا اور یہ لے ان کی تنقید میں اتنی بڑھی کہ انھیں پوری اردو شاعری میں "چند دھنچلوں اور بوندوں" کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آیا۔ کلیم الدین نے اردو زبان اور فن داستان گوئی لکھ کر گویا اپنی اس تنقیدی کج روی کا ایک طور سے کفارہ ادا کر دیا ہے اور میرے نزدیک ان کی یہ کتاب اردو تنقید میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کلیم الدین کے اس کام کو بڑے پیمانے پر ڈاکٹر گیان چند نے آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اردو کی نثری داستانوں کی چھان بین میں ان کی نظر بڑی گہرائیوں تک گئی ہے۔ ان کی یہ کتاب تحقیق و تنقید کا خوبصورت امتزاج پیش کرتی ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد داستانوں کا نیا مطالعہ ہماری تنقید و تحقیق کا ایک اہم شعبہ بن گیا ہے جس کے بعض مفید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اردو داستانوں کے مطالعے کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں محمد حسن عسکری (انتخاب طلسم ہوش ربا) ممتاز حسین (باغ و بہار کا نیا ایڈیشن مع طویل مقدمہ) وقار عظیم (ہماری داستانیں) اور راز یزدانی مرحوم کے نام بڑی اہمیت رکھتے ہیں جن کے متعدد مقالے داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا سے متعلق آجکل، نیا دور، نقوش اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے۔ ابھی چند ماہ پہلے ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب "باغ و بہار، ایک تجزیہ" شائع ہوئی ہے جو اس سلسلے کی تنقید و تحقیق کو ایک قدم آگے بڑھاتی ہے۔

رجب علی بیگ سرور پر بھی خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ضمیر حسن دہلوی کی کتاب "فسانۂ عجائب کا تنقیدی مطالعہ" اور نیر مسعود رضوی کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ "رجب علی بیگ سرور، حیات اور کارنامے" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے سرور کے سلسلے میں گزشتہ ایک صدی کے تنقیدی فیصلوں پر نظر ثانی کے لیے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے استاد اطہر پرویز نے "فسانۂ عجائب" کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کر کے اس کے متن کی تصحیح کی ہے اور اس پر ایک طویل تنقیدی و تحقیقی مقدمہ لکھا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی جلد ہی شائع ہو جائے گی اور اہل نظر سے خراج تحسین وصول کرے گی۔

داستانی ادب کی بازیافت کے سلسلے میں پچھلے دنوں ایک معرکے کی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "قصۂ مہر افروز و دلبر" ہے۔ اس کتاب کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر مسعود حسین (ریڈر و صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) کے سر ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آغا حیدر حسن صاحب کے ذخیرۂ کتب میں تھا جو انھیں ۱۹۲۹ء میں خانقاہ گوالیار کے سجادہ نشین حضرت سید علی شاہ قادری دہلوی ثم الگوالیاری معروف بہ حضرت جی نے

رئیس مینائی

غزل

آنگن میں چاند اور ستارے اتار دو
یہ رات تم بھی جاگ کے یونہی گزار دو

ماضی کے کتنے نقش ہیں دھندلے پڑے ہوئے
یادوں کے جھنڈ میں انھیں پھر سے سنوار دو

گاؤں میں اس کا نام ہے آوارہ بدچلن
تم اس کو دیکھ بھال کے بابا! ادھار دو

مدت سے سطح آب پہ کیوں یہ جمود ہے
پتھر اٹھاؤ، پھینک کے اک نقش ابھار دو

کتنی کہانیاں ہیں ادھوری پڑی ہوئیں
پھر ان کے تانے بانے لہو سے نکھار دو

مقتل ہو کوئے یار ہو یا ہو وہ میکدہ
خیرات جس جگہ بھی ہو دامن پسار دو

نذر کیا تھا۔ اس قسم کی قلمی کتابیں اور بھی خانہ انوں میں محفوظ ہوں گی لیکن ان کی ادبی، تہذیبی اور لسانی اہمیت کو پہچاننے کے لیے جس نظر کی ضرورت ہے وہ بدقسمتی سے ہمارے یہاں عام نہیں ہے۔ گذشتہ بیس پچیس برسوں میں ہمارے یہاں تحقیق کا میلان بہت تیزی سے بڑھا ہے لیکن اس سلسلے میں افسوسناک حد تک افراط و تفریط ملتی ہے۔ تحقیق کو بعض لوگوں نے ایسا سرخاب کا پر سمجھ لیا ہے جسے لگانے کے لیے ہر کس و ناکس مترد د نظر آرہا ہے مگر اس گرم بازاری میں نہ تو اصلی اور جعلی سکوں میں تمیز کی جارہی ہے اور نہ ہنس اور کوّے کا امتیاز رہ گیا ہے۔ کسی کتاب کا صرف غیر مطبوعہ یا قلمی ہونا یا طبع ہونے کے بعد نایاب یا کمیاب ہو جانا ہی اہم نہیں ہے، اس کی افادیت یا قدر و قیمت کو پرکھنے کے لیے بہت گہرے تنقیدی شعور کی ضرورت ہے ورنہ اس کے بغیر تحقیق محض برائے تحقیق یا نقل نویسی ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہت معمولی صلاحیت رکھنے والے حضرات جو تصنیف یا تخلیق کا اپنے آپ کو اہل نہ پاکر کسی چھپی ہوئی کتاب پر مرتب یا مولف کی حیثیت سے اپنا نام دیکھنے کے آرزومند ہوتے ہیں اس سلسلے میں بہت پیش پیش ہیں۔ ضرورت ہے کہ سنجیدہ اہل قلم ہر طرح کی مروت اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اس طرح کی خام اور فضول کوششوں کا جائزہ لیں کیونکہ اگر ان سے اغماز برتا گیا تو ان کے منفی اثرات معتبر اور بامقصد تحقیقی کارناموں کی طرف سے بھی پڑھنے والوں کے ذہن کو مشکوک بنا دیں گے۔ اس طور پر یہ فن جو اپنی جگہ پر بے حد کارآمد ہے پایۂ اعتبار سے گر جائے گا اور اس کو ہمارے ادب میں وہ جگہ نہ مل سکے گی جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین نے "قصہ مہر افروز و دلبر" کے نسخے کو جس دیدہ ریزی کے ساتھ پڑھا ہے اور خود نفس موضوع کے جن جن نازک پہلوؤں پر ان کی نظر پہنچی ہے اس کا اندازہ تو کتاب کو پڑھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ کچھ دن پہلے قاضی عبدالودود صاحب نے کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ کوئی کتاب کس طرح نہیں ایڈٹ کی جانی چاہیے اس کی سب سے اچھی مثال یہ کتاب فراہم کرتی ہے" میرا یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر ہمارے تحقیق کے شوقین حضرات یہ اندازہ لگانا چاہتے ہوں کہ کس قسم کی کتابوں کو منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے اور ان کی معنویت اور اہمیت کو کس طرح اجاگر کرنا چاہیے وہ مسعود صاحب کی مرتب کی ہوئی یہ داستان ملاحظہ فرمائیں اور اس کے مقدمے کو غور سے پڑھیں۔

جیسا کہ مرتب نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے کہ اس کتاب کے قلمی نسخے سے بظاہر یہ پتہ لگانا آسان نہیں ہے کہ اس کا زمانہ تصنیف کیا ہے مگر جو لوگ ترقیمہ وغیرہ سے آگے جاکر کتاب کے مطالب کی گہرائیوں میں جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ ایسی داخلی شہادتیں فراہم کر لیتے ہیں جن سے کتاب کے زمانے اور اس ماحول کا تعین ہو سکتا ہے جس میں وہ وجود میں آئی۔ چنانچہ مسعود صاحب نے تجزیے کے لئے اس کتاب کے دو پہلوؤں پر خاص طور سے غور کیا ہے۔ ایک تو خود اس کا موضوع اور اس قصے کی جزئیات و تفصیلات کے بیان میں اپنے دور کے تاریخی عوامل اور مظاہر سے اس کا گہرا تعلق دوسرے اس کی لسانی و اسلوبی خصوصیات۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ موصوف کو اس سلسلے میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ غالباً ان کا وجیہ تنقیدی و ادبی ذوق اور اردو کے لسانی ارتقاء پر ان کی گہری نظر ہے ان کے تجزیے کے مطابق یہ کتاب اورنگ زیب کے بعد لگ بھگ محمد شاہ کے عہد میں لکھی گئی جزئیات و تفصیلات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف (عیسوی خاں بہادر) دلی کا رہنے والا ہے اور لال قلعے سے اس کا گہرا تعلق ہے دوسرے وہ جس ماحول کو پیش کر رہا ہے وہ زوال آمادہ مغلیہ تہذیب کا ماحول ہے۔ کتاب کی زبان اور اسلوب کے سلسلے میں مقدمہ نگار کی یہ رائے دیکھنے کے قابل ہے۔

> "اردو کے قدیم ادب میں اس سے زیادہ سہل اور سادہ عبارت نظم و نثر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ پوری داستان بول چال کی زبان میں لکھی گئی ہے بلکہ جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا لکھوائی گئی ہے جملوں کا دروبست تحریر کا نہیں تقریر کا ہے جملہ ادا کرتے وقت مصنف کو نہ بحث اکی خبر ہے اور نہ خبر کی۔ "وہ" اور "اور" کی تکرار سے فقروں کا تسلسل قائم رکھتا ہے"۔
>
> "اس میں شک نہیں کہ خالص اسلوب کے نقطۂ نظر سے عیسوی خاں کی عبارت کم رنگ سے درست نہیں۔ شمالی ہند میں فارسی کے مقابلے میں جس زبان کو دربار نے ٹھکرا دیا تھا اور محمد شاہ کے عہد تک لائق اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ظاہر ہے اس میں ادبی تخلیق کرنا کس قدر دشوار طلب ہو گا مصنف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اور نہ اردو شاعری کے رچے ہوئے اسلوب کی داغ بیل پڑی تھی۔ اس کے پیش نظر یا تو فارسی داستانیں نقلی یا عکسی اور ریختی کال کی شاعری کے وہ نمونے جو زبان زد خلائق ہو چکے تھے چنانچہ انھیں روایات سے وہ اپنے ادبی اسلوب کے تانے بانے مرتب کرتا ہے۔ داستانیں عام طور پر برمحل اشعار سے بھری پڑی ہوتی ہیں۔ قصہ مہر افروز اس اعتبار سے

منفرد ہے کہ اس میں فارسی، اردو یا ہندی کا ایک بھی شعر یا دوہا درج نہیں کیا گیا ہے۔ اردو اشعار کی غیر موجودگی سے اس کی قدامت اور مسلم ہو جاتی ہے اور یہ قیاس کہ یہ قصہ محمد شاہ کے عہد کی تصنیف ہو سکتا ہے صحیح ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت شمالی ہند میں اردو شاعری کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی البتہ فارسی اور ہندی اشعار سے اجتناب حیرت ناک ہے۔"

"قصہ کی زبان اکھڑی اکھڑی ہونے کے باوجود تخیل کی بے پناہ قوت رکھتی ہے جو زبان کو اسلوب کے نئے سانچوں میں ڈھالنے میں مصروف کار ہے۔ اس میں ندرت ہے، خوب ہے، گہرائی اور بینائی ہے، سادگی اور توانائی ہے۔ مصنف جو کہنا چاہتا ہے بے محابا کہہ جاتا ہے۔ جو دکھانا چاہتا ہے دکھا جاتا ہے اور وہ ٹیک سے درست نہ ہونے کے باوجود ہم مصنف کی قوت اظہار پر عش عش کر کے رہ جاتے ہیں۔ دراصل قصہ کی زبان شمالی ہند میں پہلی بار اردو کا ادبی سطح پر استعمال ہے اس لیے عیسوی خاں کی حیثیت ایک بانی اسلوب کی ہے جسے پہلی بار بول چال کی زبان کو ادبی سطح بخشنے کا موقع ملا ہے۔"

"تبلیغ اسلام کا وہ جذبہ جو دیگر داستانوں کا جزو لازم ہے اس قصے سے بالکل غائب ہے۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ قصہ ایک ایسے زمانے میں لکھا گیا ہے جب لال قلعۂ دہلی سے روحِ عالمگیری رخصت ہو چکی تھی۔"

"قصہ مہر افروز کی قدامت کا تعین اس کی زبان کے تجزیے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف قصے کی زبان خسرو کے عہد کی زبان دہلی کی ترقی یافتہ شکل ہے تو دوسری طرف جہانگیری عہد کے مصنف افضل کی "بکٹ کہانی" کی زبان سے ان معنوں میں جدید ہے کہ اس میں برج بھاشا کا پٹ کم پایا جاتا ہے۔ یہ شمالی ہند کے دو ہم عصر مصنفین فائز اور فضلی کی زبان سے بھی مختلف ہے اس لیے کہ یہ دونوں کتابی اور ادبی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے برعکس عیسوی خاں اس عہد کی بول چال کی زبان کو اپنے قصے کے لیے منتخب کرتا ہے۔ بکٹ کہانی کی زبان میں ٹھیٹھ اردو کے محاورے کا تعین نہیں ہو سکتا۔ اس کا مصنف ابھی تک ریختہ گوئی کی روایات کا تتبع کر رہا ہے اس کے برعکس قصہ مہر افروز کی زبان، زبان دہلوی کا نقش ثانی ہے جو شاہجہاں کے ۱۶۴۸ء میں دار السلطنت آگرہ سے دہلی منتقل کرنے کے بعد متشکل ہوتا ہے۔ اردو کا مرکز ثقل آہستہ آہستہ برج بھاشا کے علاقے سے ہٹ کر کھڑی بولی اور ہریانی کے علاقے میں آ جاتا ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے اس انتقال سلطنت کے دوررس نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ سترھویں صدی کے نصف آخر میں ہی جدید اردو کا وہ ڈول متعین ہوتا ہے جس کے پہلے نمونے ہمیں دہلوی مصنفین فائز، فضلی اور عیسوی خاں کے یہاں ملتے ہیں۔"

آگے چل کر مرتب نے اپنے مقدمے میں تفصیلی طور پر داستان کی زبان اور اسلوب کی لسانی خصوصیات کو مع مثالوں کے واضح کیا ہے۔ یہ مقدمہ تحقیق اور تنقید کے امتزاج کا ایک مثالی نمونہ ہے جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

"داستان مہر افروز و دلبر" کی اشاعت کو اردو تحقیق و تنقید کی دنیا میں ایک اہم واقعہ سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کتاب کی اشاعت سے ہمیں اپنے ادبی اسالیب اور اردو نثر کے ارتقا کے مطالعے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ باغ و بہار اور دوسری اہم کتابوں کے ساتھ اس داستان کو بھی ہمیں اپنے نصاب کا ضروری جزو بنا لینا چاہیے۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گلزار خلیل۔ (مجموعہ کلام)

مصنف: خلیل احمد خلیل ہمدانی

مرتب: طفیل احمد تابش بیکانیری

ملنے کا پتہ: آزاد منزل، نزد مدینہ مسجد بیکانیر (راجستھان)

قیمت: تین روپے

قدیم اردو (جلد دوم ۱۹۶۷ء)

مدیر: ڈاکٹر مسعود حسین خاں

ناشر: شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (آندھرا پردیش)

قیمت: تیرہ روپے

مراسلات

غالب کا اسلوب از شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی

رسالہ ماہ نو کراچی جنوری ۱۹۵۰ میں "آئندہ ماہ کے متوقع مضامین" کی ایک فہرست شائع ہوئی تھی جس میں ایک عنوان یہ بھی تھا، غالب کا اسلوب از شمس العلماء ذکاء اللہ دہلوی۔

لیکن فروری ۵۰ میں یہ مضمون شامل نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں میں نے سید وقار عظیم صاحب سے جو اس وقت ماہ نو کے مدیر تھے دریافت کیا کہ انھوں نے مذکورہ مضمون کہاں سے شائع کرنا چاہا تھا۔ اس لئے کہ میرا خیال ہے یہ مضمون پہلے کہیں شائع ہو چکا ہے۔ شاید میرا خط موصوف تک نہیں پہنچ سکا اس لئے میں اس مراسلے کے ذریعے وقار صاحب ہی سے نہیں دیگر اہل نظر سے بھی غالب کے بارے میں ذکاء اللہ کے مضمون کی نشاندہی کی درخواست کرتا ہوں۔

ماہ نو فروری ۵۰ ہی میں ایک مضمون احتشام الدین دہلوی کا بعنوان "غالب کے چند غیر مطبوعہ لطیفے اور شعر" بھی شائع ہوا ہے اور مضمون نگار کے نام کے ساتھ مرحوم بھی چھپا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کی اشاعت کے وقت مضمون نگار حیات نہ تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مضمون بھی پہلے کہیں چھپ چکا تھا اور ماہ نو میں اس کی اشاعت دوسری بار ہوئی تھی۔ اگر کسی صاحب کے علم میں پہلی اشاعت کا مقام ہو تو مطلع فرمائیں نیز میں احتشام الدین دہلوی کی تاریخ وفات بھی جاننا چاہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وقار عظیم صاحب، ظفر قریشی، شان الحق حقی اور دیگر اہل نظر اطلاع کی زحمت برداشت فرما کر مجھے نوازیں گے۔ میرا پتہ یہ ہے۔

(اکبر علی خاں۔ رامپور رضا لائبریری رامپور یو۔پی)

اردو کی ترقی کے لئے مختلف سطحوں پر کام کی ضرورت

میں خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری غلط فہمی دور کر دی نیز یکم فروری کے "ہماری زبان" میں رفتار کے کالم کے تحت اپنے پیش کردہ خیالات پر غور و فکر کی دعوت دی میرے ردعمل کے متعلق ان کا قیاس صحیح ہے کہ تحریک دہلی کا اپریل کا شمارہ میرے سامنے تھا ان کے مشورے کے مطابق میں نے یکم فروری ۱۹۶۸ کا "ہماری زبان" بھی دیکھا موصوف نے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے وہ بلاشبہ قابل غور ہیں۔ مشاعروں کی عام فضا کی تصویر کشی بھی انھوں نے غلط نہیں کی ہے۔ مشاعروں کی تمام فضا کو بدلنے اور انھیں زیادہ موثر اور کارآمد بنانے کی ضرورت کا احساس ہر سنجیدہ اور بالغ نظر اردو کے نام لیوا کو ہونا ہی چاہئے مجھے اس سے سو فیصد اتفاق ہے۔ لیکن موصوف کی تحریر کی آخری عبارت یہ سمجھنے پر مجبور کرتی ہے کہ وہ مشاعروں کی بجائے محض کتابوں اور رسالوں کی اشاعت کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ میں بھی ایسے مشاعروں کے حق میں نہیں ہوں جن میں شعرا کی اکثریت محفل مشاعرہ کو محفل قوالی میں تبدیل کر دیتی ہو یا پھر وہ مسائل پیدا کر دیتی ہے جس کی تفصیل موصوف نے مختلف مثالوں اور حوالوں کے ذریعہ پیش کی ہے لیکن میں جملہ معترضہ کے طور پر موصوف سے ہی ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ مدیر تحریک نے موصوف کی محولہ بالا تحریر (مطبوعہ یکم فروری ہماری زبان) اور "گفتگو" شمارہ (۱۲) کے اداریہ بعنوان "محض دائرے" سے مخصوص اقتباسات کیوں پیش کئے؟ بظاہر اس کا سبب یہ نظر آئے گا کہ دونوں اقتباسات میں چونکہ مشاعرے سے متعلق خیالات پیش کئے گئے ہیں اس لیے اردو شاعری کے مفاد کے پیش نظر قارئین تحریک کو ان خیالات سے روشناس کرانا ضروری سمجھا گیا۔ معلوم نہیں موصوف نے کیا سمجھا لیکن وہ حضرات جو تحریک دہلی کے مزاج اور رویے سے واقف ہیں ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ یہ محض دو بتوں کو ٹکرانے کی ایک کوشش ہے۔

آخر مدیر تحریک نے ان ہی صفحات پر دوسرے اہم مسائل پر روشنی ڈالنے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی؟

میرا خیال ہے کہ مشاعروں کے لئے زیادہ سے زیادہ چندہ دینے والوں میں بھی ایسے لوگ ملیں گے جن کی دلچسپی اردو زبان و ادب سے محض ظاہری ہوتی ہے۔ وہ مشاعروں سے سستی تفریح حاصل کرنے کے علاوہ دراصل اردو زبان و ادب کے اہم مسائل کی طرف سے اردو والوں کی توجہ ہٹائے رکھنا چاہتے ہیں۔ مرکزی سرکار اور ریاستی حکومتیں بھی کم و بیش یہی کر رہی ہیں۔ کانگریس دور اقتدار میں یہی ہوا آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں کہ "مشاعروں کے ذریعہ اردو شاعری کے جو نمونے ہمارے سامنے آتے ہیں وہ قطعاً اس شاعری سے مختلف ہیں جو کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے لیکن کتابوں اور رسالوں کی سرپرستی کے بجائے کیوں ہم مشاعروں کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں اور کس لئے قوم و ملک کا لاکھوں روپیہ ہر سال ایسے شعرا پر صرف کیا جاتا ہے جو اردو شاعری اور اردو زبان کو بھی بگاڑ کر رسوا کر رہے ہیں۔ ان مسائل پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے"

موصوف نے بات بہت صحیح کی ہے کیا اچھا ہوتا کہ وہ اس مختلف شاعری کی طرف بھی کوئی اشارہ کر دیتے تاکہ نئی شاعری سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو جاتا اور کتابوں اور رسالوں کا معیار بھی سامنے آ جاتا۔ جہاں تک اردو کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے اور ٹھوس عملی اقدام کی طرف متوجہ ہونے کا تعلق ہے عرض کرنے دیجئے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلے آپس کے ذاتی اختلافات کو دور کرنے کی ضرورت ہے اس کے

ہم میں وہ احساس پیدا کیا جائے گا جو ہماری لسانی حمیت کو جھنجھوڑ سکے اور وہ جذبہ جو آتشِ نمرود کا جواب پیدا کر سکے۔ یہ سارا کام کئی سطح پر ایک ساتھ کرنا ہوگا۔ بنیادی سطح پہ اردو کے شبینہ مکتب اور ابتدائی مدارس کا قیام ضروری ہے اردو پرائمری، اپر پرائمری اور مڈل اسکول بھی قائم کئے جائیں۔ بنیادی مدارس کا قیام کوئی مشکل نہیں۔ صرف چند افراد کی تگ و دو اور کچھ پیسوں کی قربانی درکار ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر ہم تمام عمر بھی اردو کے مطالبات کے لئے لڑتے رہے اور اردو کے بنیادی سرچشموں پر توجہ نہ دی تو اس کا قوی اندیشہ ہے کہ آنے والی نسلیں اردو سے یکسر بیگانہ ہو جائیں۔ اردو صحافیوں کو اس سلسلے میں اپنی تمام سیاسی مصلحتوں کو بھول کر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اردو عوام سے ان کا رابطہ براہ راست ہے اس لئے موثر طریقہ پر اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ اردو کے مختلف اداروں اور محافظ دستوں کو بھی اس طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ میں تو تبلیغی جماعت کے سربراہوں سے بھی یہی گذارش کروں گا کہ اپنے پروگراموں میں اردو مدارس و مکاتب کا قیام بھی شامل کر لیں تو انھیں حصول مقصد میں دونی کامیابی ہاتھ آئے۔ انجمن ترقی اردو کی شاخیں اردو کے بیشتر علاقوں میں پھیل چکی ہیں لہٰذا اس انجمن سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس طرح کا جذبہ پیدا کرنے میں زیادہ موثر ثابت ہوگی۔ مختصر یہ کہ یہ کام ہماری فوری توجہ کا متقاضی ہے اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کیا جائے کہ اب تک جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے وہ غلط تھا یا ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ اردو کی لڑائی مختلف محاذ اور مختلف سطح پر لڑی جانی چاہئے اردو کے تحفظ و بقا کے لئے جنگ کے پیمانے پر کچھ کرنا ضروری ہے۔ اردو ادیبوں کو بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ قدیم و جدید کی جنگ میں کہیں ایسے عناصر حاوی نہ ہو جائیں جو ہمارے درمیان اردو کے بنیادی مسائل کے معاملے میں بھی اختلافات پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی فروخت نیز اردو اخبارات و رسائل کے معیار کے متعلق خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے خیالات بجا اور قابل توجہ ہیں۔ اردو ادیبوں کو مشترکہ طور پر شیئرز کی بنیاد پر پبلشنگ کا کام شروع کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔ اس وقت اس طرح کے جتنے بھی اشاعتی ادارے ہیں انھیں اپنے طریقۂ کار میں مناسب تبدیلی لانے اور مطمح نظر میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(انیس امام)

تصحیح

آپ نے میرا جو مضمون رسالہ "جدید" ... جولائی ۹۸ء کے ہماری زبان میں قومی آواز سے نقل کیا ہے اس میں ایک بڑی غلطی رہ گئی ہے جو قومی آواز میں بھی تھی لیکن تیسرے دن اس کی تصحیح کر دی گئی تھی۔ ممنون ہوں گا اگر اگلے شمارے میں آپ کے یہاں بھی تصحیح ہو جائے تاکہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو۔ ہماری زبان کے کالم ... کی سطر میں انگریزی اور سنسکرت کے بجائے اردو اور سنسکرت چھپ گیا ہے، جو غلط ہے۔ انگریزی کی جگہ اردو ہونا چاہئے جیسا اس کے پہلے کی سطر میں ہے۔

([illegible])

انیس انور

مکتوب لندن

اردو برائے عبادت۔

گذشتہ ہفتہ کوونٹری کیتھیڈرل میں برطانوی تاریخ میں پہلی بار عبادت کے لئے اردو زبان کا استعمال کیا گیا۔ یہ اہتمام بھارت و پاکستان سے تعلق رکھنے والے عیسائیوں کے لئے خصوصی طور پر کیا گیا تھا۔ اس بابرکت تقریب میں تقریباً پانچ سو مسیحی شریک ہوئے اس اجتماع کے انعقاد کا سہرا ایک بھارتی مسیحی گروپ کے سر ہے۔

انتخاب مشرق

کالا لوگ

جے ساے رقیبؔ لندن

لاکھ گورا لوگ ہیں جو بات کالا لوگ ہے
لیکن انڈین مُلک کی بات کالا لوگ ہے

پھر محاذِ جنگ کیوں کھولا گیا ان کے خلاف
سارے اخباروں کے مخ نامے کالا لوگ ہے

کونسلوں، جلسوں، جلوسوں اور بازاروں میں یہ
ایک ہنگامہ سا کیوں ہوتا ہے کالا لوگ ہے

رنگ لائے نہ کہیں یہ فرقہ و رنگ و نسل اب
وقت کہتا ہے یہ سب حالات کالا لوگ ہے

کر اٹھیں نے فیکٹری میں یہ پتے کی بات کی
آنکھ گورا لوگ ہے اور بات کالا لوگ ہے

شاید لندن نے وعدہ آج پھر کل پر رکھا
ہے غلط نہیں اسے بدذات کالا لوگ ہے

انجمن ترقی اردو بنارس کا جلسہ

بنارس۔ انجمن ترقی اردو بنارس کی مجلس منتظمہ کا ایک جلسہ ۳۰ جون کو منعقد ہوا۔ جس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔ (۱) انجمن ترقی اردو بنارس کی مجلس منتظمہ کا یہ جلسہ اُردو زبان والے کارکنوں کے اردو زبان میں عہدو فاداری کے مطالبہ پر گورنر پردیش ڈاکٹر بی گوپال ریڈی صاحب کی لسانی پالیسی کو بنظر استحسان دیکھتا ہے۔ جس کے تحت انھوں نے اردو داں نیز غیر ہندی داں کارپوریٹروں کی پریشانی کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے جائز مطالبہ کو تسلیم کیا ہے۔ انجمن ترقی اُردو بنارس کی مجلس انتظامیہ گورنر موصوف کی وسیع النظری سے یہ امید رکھتی ہے کہ وہ حد بندی کمیشن کے سفارشات کالعدم ہی امید رکھتا ہے کہ وہ حد بندی کمیشن کے سفارشات نیز چیف منسٹرس کانفرنس ۱۹۶۱ء کے فیصلہ کے پیش نظر بنارس شہر کے ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں اردو والوں کی تعداد کے بموجب جو سرکاری اعداد و شمار کے لحاظ سے ۲۰ فی صدی ہے اور ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں یقینی طور پر بڑھی ہے۔ اس سلسلہ میں سرکاری آفسوں، ڈاکخانوں کی فہرستوں اور انکم ٹیکس وغیرہ پر اردو کے رجسٹر کی سہولتیں بہم پہنچانے کے احکام متعلقہ حکام کو صادر فرمائیں گے۔ تاکہ لسانی اقلیتیں مطمئن ہو کر قومی یکسانیت کے جذبات کو پروان چڑھانے میں کثرت کے ساتھ کام میں ہو سکیں۔ یہ جلسہ کارپوریشن کو اردو درخواستوں کے قبول کرنے اور ان کے جوابات عرضی دہندہ کی درخواستی زبان میں دیئے جانے کے مطالبہ پر عمل درآمد کرانے کے لیے گورنر صاحب موصوف سے مناسب اقدامات کرنے کی درخواست کرتا ہے کیونکہ حکومت اتر پردیش نے گورنمنٹ آرڈر نمبر ۔۔۔ مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۶۳ء کے مطابق مذکورہ بالا اصول کے تا حال عمل تسلیم کر لیا ہے۔

۲۔ انجمن ترقی اُردو بنارس کی مجلس منتظمہ کا یہ جلسہ الحاج حافظ محمد احمد صاحب ایڈووکیٹ کے سانحہ ارتحال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور خداوند رب العزت سے دست بدعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(دیتا رسول سکریٹری)

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی جانب سے شعرا کو استقبالیہ

کلکتہ۔ ایران سوسائٹی میں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے زیر اہتمام، فراق گورکھپوری اور دوسرے مہمان شعراء کو استقبالیہ دیا گیا۔ جلسے کی صدارت جناب سید امیر رضا کاظمی نے فرمائی۔

فراق گورکھپوری نے اس موقع پر اردو کے ساتھ سلوک نا روا پر اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا کہ شمالی ہندوستان میں جہاں کہ اُردو کو نمایاں مقام حاصل تھا ہندی دوستوں نے ایسی چالیں چلیں کہ اُردو خود بخود سسک سسک کر دم توڑ دے۔ کسی بھی ادب کو مذہب کا رنگ دے کر بدنام کرنا، علامت بتانا بہت ہی خطرناک اور غلط ہے۔ جس طرح بنگلہ زبان بنگال کے ہر فرقہ کے لیے ہے ہندو مسلمان سب کی ایک ہی زبان ہے۔ اُردو کسی ایک مذہب کی زبان نہیں ہے۔ بار بار ہم یہی آواز بلند کرتے رہیں گے۔

فراق صاحب نے اپنی تقریر میں پُر زور الفاظ میں کہا کہ یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ایک طرف اُردو کو مٹانے کی تمام تر کوششیں جاری ہیں اور دوسری طرف لوگ اردو کے ناولوں افسانوں اور شعروں کے مجموعوں کو دیوناگری رسم خط میں چھاپ کر کروڑوں روپیے کا نفع کما رہے ہیں۔ آپ نے مزید کہا کہ اردو رسم خط کو جو ختم کرنا چاہتے ہیں ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے میں کافی دشواریاں ہیں۔ اُردو رسم خط کو کسی بھی صورت میں بھی نہیں ختم ہونا چاہیئے کیونکہ اُردو کی کتابیں جب دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوتی ہیں تو پڑھنے والوں کے لیے بڑی دشواری ہوتی ہے وہ کتابیں ان کے سمجھ میں نہیں آتیں کیونکہ ہندی پڑھنے والے اُردو کا صحیح تلفظ ہی نہیں کر سکتے۔ تو اُردو کی تصانیف کو ناگری رسم الخط میں تبدیل کرنے سے زیادہ اردو کو ناگری رسم الخط میں تبدیل کرنے کا خیال ہی بے تکا ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں بھی ہندی رسم الخط کو مٹانے کی کوششیں نہیں ہوئیں جب کہ وہ جس طرح چاہتے کرتے مگر انھوں نے فیاضی و دریا دلی کا ثبوت دیتے ہوئے فارسی و ہندی کے ساتھ اُردو شامل کر کے نئی زبان "اُردو" کو جنم دے کر بخش دیا۔

انھوں نے کہا کہ اردو کو علامت دوگی سے ضروری نا چاہیے جو لوگ اردو سے محبت رکھنے والوں کو دونوں ہی رسم الخط پڑھنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی انگریزی کا بھی جاننا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی ضروری ہے۔ انھیں باتوں کو رکھ کر انجمن ترقی اُردو کو اردو کی ترقی کے لیے کام کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد مہمان شعراء فراق گورکھپوری، اقبال مرادآبادی، منظور احمد ری، پیام فتحپوری، نسیم فاروقی، کرشن بہاری، نور لکھنوی، ماجد سلیمان اور نفیس لکھنوی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ان کے علاوہ مقامی شاعروں میں ابراہیم ہوش، مالک لکھنوی، مظفر حیدری، علقمہ شبلی، اعجاز افضل اور وکیل اختر نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔

(اے۔ مجید)

یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان تین کی زبانوں میں ہونگے

نئی دہلی۔ مرکزی حکومت کی یہ تجویز ہے کہ کل اور دوسری مرکزی ملازمتوں کے امتحان میں بیٹھنے والے امیدواروں کو یہ اجازت کا جواب ان زبانوں میں سے کسی میں بھی دینے کی اجازت دی جائے جو دستور کے آٹھویں شیڈول میں درج ہیں۔

وزارت داخلہ کے ایک ترجمان نے یاد دلایا کہ حال ہی میں۔

پارلیمنٹ نے زبانوں کے بارے میں جو ریزولیوشن منظور کیا ہے اس کی رو سے صرف آل انڈیا اور اعلیٰ مرکزی ملازمتوں کے لئے آئین میں درج زبانوں کو نافذ کیا جائے۔ وزارت داخلہ کا ارادہ ہے کہ یہ اصول کلرکی اور لوور ڈویژنل سروسز کے امتحانوں کے لئے بھی نافذ کیا جائے۔ یہ اسکیم جس قدر جلد ممکن ہوگا یونین پبلک سروس کمیشن کے مشورے سے شروع کی جائے گی۔ (ریاست)

فلموں میں اردو کی مقبولیت کا اعتراف

لکھنؤ۔ ہندوستان کی فلمی صنعت پڑھے لکھے لوگوں اور اہل علم کے حلقہ سے نکل کر عام لوگوں، کسانوں اور مزدوروں کی دلچسپیوں کی حد میں داخل ہو گئی ہے۔ اس لئے اعلیٰ درجہ کی فلموں کی تیاری کی امید نہیں کی جا سکتی۔"

یہ ہے وہ شکایت جو فلمی دنیا کی دو مشہور شخصیتوں سنیل دت اور بخشی جنگ بہادر نے کل یہاں ایک اخباری نمائندے سے بات چیت کرتے ہوئے کی۔ انھوں نے فلمی صنعت کی اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اعتراف کیا لیکن صرف اس لئے اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر سکیں انھوں نے اپنی اور کئی دوسرے فلمی صنعت کاروں کی دھن میں شانتارام کا نام بھی شامل ہے، مثالیں پیش کیں کہ جب کوئی اعلیٰ درجہ کی علمی اور معلوماتی ہندی فلم تیار کی تو اس پر خسارہ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ جس طرح انھوں نے فلموں کی عوامی مقبولیت کا اظہار کیا اس کے لب و لہجہ میں غیر شعوری طور پر اردو کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا بھی ذکر کر ڈالا اور کہا کہ اس وقت بمبئی کے سارے فلمی حلقہ پر اردو شاعروں نے قبضہ کر رکھا ہے۔" انھوں نے اس سلسلہ میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ اترپردیش میں قائم ہونے والے فلمی کارپوریشن کے ذریعہ ہندی شاعروں کی کمی کو دور کیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندی کے قومی زبان قرار دئے جانے کے بعد سے فلمی دنیا میں اس کا گھٹیا مواد تو بہت ہی تشویشناک ہے۔ (ریاست)

فلموں میں دیوناگری کے ساتھ اردو رسم خط کو نظرانداز کرنے کی مخالفت

بھوپال۔ یہاں کی مقتدر ادبی انجمن حلقۂ ارباب ادب کے ایک مخصوص جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اردو کے مشہور ترقی پسند شاعر ساحر لدھیانوی نے کہا کہ میں قطعاً اس کے حق میں نہیں ہوں کہ فلموں کے ٹائٹل صرف دیوناگری رسم خط میں ہوں اور اردو کو نظرانداز کر دیا جائے۔ آپ نے کہا کہ یہ اردو کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ بہتر یہی ہے کہ ہندی، اردو یا ہندوستانی زبان میں بنی فلموں کے ٹائٹل دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخطوں میں دئے جائیں۔ اس جلسہ میں جناب جاں نثار اختر بھی شریک تھے اور انھوں نے بھی اس کی تائید کی۔ یہ جلسہ برقی ہاؤس میں منعقد ہوا۔ ساحر اور جاں نثار اختر نے اپنا منتخبہ کلام بھی سنایا۔ اس میں ساحر کی نامکمل نظم اور جاں نثار کی وہ رباعیات بھی شامل تھیں جن میں روایتی وصال و فراق سے ہٹ کر ازدواجی زندگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ جلسہ میں اختر سعید، شاہد بھوپالی، اختر نظمی، سلطان حیدری، مظفر رزمی، ایم۔ اے شمیم نے بھی اپنا کلام سنایا۔ پروفیسر آفاق احمد نے "حلقہ" کی طرف سے مہمان شعراء کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے درمیان وہ شعراء موجود ہیں جو ایک اچھے خوشحال سماج کی تشکیل کے لئے اپنے شعروں کی زبان سے مصروف ہیں۔ (نامہ نگار)

بنارس کارپوریشن میں اردو کا حق دینے سے انکار

وارانسی۔ شیام موہن سنگھ وال نے وارانسی کے میئر کا عہدہ سنبھال لیا۔ ڈویژنل کمشنر برج پال سنگھ سیٹھ نے ان سے عہدہ اور رازداری کا حلف لیا۔ تقریب سنگرا میں نگر مہاپالیکا کے آڈیٹوریم میں ہوئی۔ میئر نے خود حلف لینے کے بعد ایلڈرمینوں اور کارپوریٹروں (سبھاسدوں) کو حلف دلایا۔ دو ایلڈرمینوں اور پندرہ کارپوریٹروں کو حلف نہ دلایا جا سکا کیونکہ ان کا اصرار اردو میں حلف لینے کا تھا۔ میئر نے کہا کہ چونکہ ریاست کی اور نگر مہاپالیکا کی سرکاری زبان ہندی ہے اس لئے حلف ہندی ہی میں اور نگر مہاپالیکا ادھینیم کے مطابق ہی دلائی جا سکتی ہے۔ احتجاج کے طور پر مذکورہ ممبران واک آؤٹ کر گئے۔ (ریاست)

کسی بھی ہندوستانی زبان یا انگریزی زبان میں ممبر حلف اٹھا سکتا ہے

لکھنؤ۔ اترپردیش کی میونسپل کارپوریشنوں کے ممبر دستور ہند کی آٹھویں فہرست میں مندرج زبانوں میں سے کسی بھی زبان میں اردو میں بھی یا انگریزی میں حلف لے سکتے ہیں۔ کارپوریشنوں کے ممبروں کی حلف برداری کے طریقہ کار سے متعلق جن نئے قواعد کے مسودے کا اعلان ریاستی حکومت کے ایک غیر معمولی گزٹ کے ذریعہ کیا گیا ہے اس میں اس اجازت کا اندراج بھی ہے۔ (قومی آواز)

دہلی میں اردو کو دبانے کی ایک نئی کوشش

نئی دہلی۔ راجدھانی میں سہ لسانی فارمولا کے نفاذ کے ساتھ ساتھ جن سنگھ نے اردو کا حق دبانے کی پوری کوشش شروع کر دی ہے۔ چیف اگزیکیٹو کونسلر جناب وجے کمار ملہوترا نے راجدھانی کے مرکزی علاقہ میں سہ لسانی فارمولا نافذ کرنے کا اعلان کر دیا ہے جس کے تحت ہندی لازمی زبان ہوگی دوسری (غیر ملکی) زبان انگریزی، روسی، جرمن یا جاپانی اور تیسری زبان کوئی ہندوستانی زبان مگر ترجیح جنوبی ہند کی کسی زبان کو ہوگی جن سنگھ اردو کو مٹانے کے لئے جنوبی ہند کی کسی زبان کو پڑھانے کا نام لے رہی ہے۔ اس کھلی اردو دشمنی کے سلسلے میں جب یہ سوال ہوا ہے کہ کیا مرکزی حکومت ہدایات مان لی ہے تو جن سنگھ کے لیڈر نے کہا کہ تعلیم ایک ریاستی اختیار کی چیز ہے مرکز کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ (قومی آواز)

تبصرہ

اصغر عباس

جواہر لال نہرو۔ رادھا کرشنن کی نظر میں

شائع کردہ: پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ دہلی

قیمت: ایک روپیہ

زیر نظر کتابچہ RADHAKRISHNAN ON NEHRU کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ رادھا کرشنن کے ان پیغامات اور تقریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے پنڈت جی کے انتقال کے بعد مختلف موقعوں پر کیں۔ یہ تقریریں اور پیغامات مختلف عنوانات کے تحت دئے گئے ہیں جن سے قاری کو پنڈت جی کے کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان تقاریر اور پیغامات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رادھا کرشنن پنڈت جی سے بے پناہ خلوص اور عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے افکار و خیالات کی سمت اور سطح سے بخوبی واقف ہیں چنانچہ انھوں نے نہرو کے افکار کی وضاحت ان تقریروں میں جس طرح کی ہے اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ نہرو نے یقیناً کوئی نئی طاقتور اور انقلابی چیز پیش کی جس کی بنا پر سترہ سال میں ملک نے مختلف جہتوں میں خاصی ترقی کی۔ آزادی، جمہوریت، بقائے باہم، منصوبہ بندی، سماجی انصاف، سائنٹفک نقطۂ نظر وغیرہ کے خیالات تو خاصے پرانے ہو گئے ہیں لیکن ان خیالات کو زندگی کے قالب میں ڈھالنا ان میں تھرتھراہٹ پیدا کرنا ان چیزوں کو اس طرح پیش کرنا کہ یہ ہمارے حالات کے مطابق بن جائے اور یہ کہ بلند خیالات صرف لاحاصل ہی نہیں ہوتے بلکہ انھیں عمل میں بھی لایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ چیزیں تھیں جنھیں نہرو نے سوچا اور ان پر عمل کرنے اور کرانے کی کوشش کی۔ نہرو میں یہ خوبی تو تھی ہی کہ وہ دھن کے پکے تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ہر طرح کے لوگوں میں جوش و جذبہ بھی پیدا کر دیتے تھے۔ ان کی مقبولیت بھی ہر طبقہ میں تھی خواہ وہ خواندہ ہوں ناخواندہ ہوں عالی مرتبہ ہوں یا معمولی ہوں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ان کی رحلت سے ہر طبقہ میں ایک خلا محسوس کیا گیا چونکہ یہ تقریریں اور پیغامات خراج عقیدت کے طور پر ہیں اس لئے ان میں غیر جانبدارانہ اور معروضی انداز نظر کی توقع مناسب نہ ہوگی لیکن یہ تقریریں پنڈت جی کی شخصیت کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ تقریروں کے چند عنوانات سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ آزادی دلانے والا عظیم انسان، جدید ہندوستان اس کی یادگار، ایک بہت بڑا انسان دوست، ان سے بڑھ کر ہمت دلانے والا اور کوئی نہیں، بچوں کا پیارا دوست وغیرہ

اس کتابچہ کے شروع میں پنڈت نہرو اور رادھا کرشنن کی ایک تصویر بھی ہے جس سے رادھا کرشنن اور نہرو کے قریبی اور پرخلوص تعلقات پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ نہرو کے افکار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ ایک اچھا تحفہ ہے۔

صفحہ ۴ سے آگے

لڑائی میں جانے سے پہلے اس کا شوہر اس کام کو انجام دیتا تھا لیکن اس کی روانگی اس (لڑکی) کے لئے دل پر ایک بھاری بوجھ بن گئی ہے۔

دن اور ہفتے اسی طرح گذرتے گئے
ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے
فصلیں بھی آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں
لیکن کون جانتا ہے کہ اس کا شوہر (لڑائی سے) کب واپس آئے گا
ایک دن سہ پہر کے وقت
اس کا شوہر واپس آتا ہے اس کی ڈھیلی آستین ہوا میں اڑ رہی ہے
لڑائی میں اس کا ایک بازو کام آچکا ہے
اس کے تمام احباب اس کی پذیرائی کر رہے ہیں کیونکہ اب وہ لڑائی سے واپس آچکا ہے
اس کی بیوی اس کو پہلے سے بھی زیادہ چاہتی ہے
کھیت میں وہ دونوں ساتھ مل کر کام کرتے ہیں
دن اور ہفتے گذرتے جاتے ہیں
ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے جاتے ہیں
ایک فصل کے بعد دوسری فصل آتی ہے اور چلی جاتی ہے
لیکن امن و سکون کب قائم ہو کوئی نہیں بتا سکتا
لیکن امن و سکون کب قائم ہو کوئی نہیں بتا سکتا۔

آج جبکہ امن کی باتیں صرف ہوائی ہیں تمام دنیا کے سوال کا جواب صرف سیاسی مدبر ہی دے سکتے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ پرنٹر و پبلیشر سید حیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا